

تعارفِ اہلحدیث

”اہلحدیث“ فرقہ نہیں !

یہ عجیب بات ہے کہ اہل حدیث کا تصور دینی جس درجہ سادہ، سمجھ میں آنے والا اور قلب و روح کو حرارت و تپش عطا کرنے والا ہے، یا رگوں نے اتنا ہی اسے الجھا دیا ہے اور اس کے بارہ میں ایسی ایسی غلط فہمیاں پھیلا رکھی ہیں کہ الامان والاحتیاط! — سوال کم پڑھے لکھے یا جہال کا نہیں، اچھے خاصے علماء کا ہے۔ ان حلقوں میں اگر کسی جانی پہچانی شخصیت کے بارہ میں بھولے سے کسی نے یہ کہہ دیا یا لکھ دیا کہ صاحب وہ تو ”وہابی“ ”غیر مقلد“ یا ”اہل حدیث“ ہے، تو نہ پوچھئے — صرف اتنا کہہ دینے اور لکھ دینے سے اس کے متعلق طبیعت بڑی تیزی سے بدل جاتی ہے اور اس کے خلاف نفرت و تعصب بکے جانے لگتے طوفان اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

نفرت و تحقیر کا یہ بادہ تلخ انگریز کے استعماری مصالح کے علاوہ اور کن کن مقدس ہاتھوں سے کشید ہوا ہے؟ اور تہمت کی اس سازش میں کس کس نے حصہ لیا ہے؟ کن کن عناصر نے اہل حدیث کے خلاف اس نفسیاتی ہم کو چلانے میں کامیاب کردار ادا کیا ہے؟ یہ ایک مستقل اور علیحدہ موضوع ہے، جو مخصوص تحقیق و التفات چاہتا ہے۔ ہمارے نزدیک اس کے متعلق سر دست تعرض کرنا موزوں نہیں — کیونکہ سوع

اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں

تاہم اتنی بات کہہ دینے میں کوئی مضائقہ بھی نہیں کہ نفرت کی یہ ہم پورے زور و شور اور تنظیم کے ساتھ آج بھی جاری ہے۔ حالانکہ جماعت اہل حدیث کے عقائد و سرگرمیاں اور تنظیم کے ساتھ آج بھی تو ڈھکی چھپی نہیں۔ اور کوئی چیز بھی ایسی تو نہیں، جس میں اسلامی نظریہ

و تصور سے کسی درجہ میں بھی انحراف پایا جائے! — بلکہ یوں کہنا چاہیے، ہم تو معتبوب اور مستوجب تعزیر ہی اس بناء پر ہیں کہ فقہ ہو یا کلام، تفسیر ہو یا حدیث، دین کے معاملہ میں، ہم ادنیٰ انحراف کو بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں۔

ہمارا سیدھا سادہ عقیدہ یہ ہے کہ حق و صداقت کو صرف کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی میں محصور و منحصر مانو۔ اور سعی و عمل یا فکر و عقیدہ کا جب بھی کوئی نقشہ ترتیب دو، تو تابش اور ضلوع کے لیے اسی آفتاب ہدایت کی طرف رجوع کرو جس کو اللہ تعالیٰ نے ساری کائنات انسانی کے لیے سراج منیر ٹھہرایا ہے :

”يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۝ وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا“ (الاحزاب : ۴۵، ۴۶)

یہاں اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ ہم کسی طرح بھی تاریخی ارتقاء کے منکر نہیں۔ اور زمانے کے ناگزیر تقاضوں کے تحت فقہ و کلام کے سلسلہ میں ہمارے ہاں جلیل القدر علماء اور ائمہ نے جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں، ان سے ذرہ برابر صرف نظر نہیں کرتے۔ ہمارے نزدیک امام ابو حنیفہؒ کی فکری و آئینی کاوشیں، امام شافعیؒ کی اصول فقہ و حدیث کی ترتیب، امام مالکؒ کا اصحابِ مدینہ کے تعامل کو دست برد زمانہ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لینا اور امام احمد منبیلؒ کی جمع حدیث کی وسیع تر کوششیں ہماری تہذیبی انفرادیت کا زندہ ثبوت ہیں، اور یہ ایسی چیزیں ہیں کہ جن پر ہم جس قدر بھی فخر و ناز کریں کم ہے۔

ہم حق کو ان سب مدارسِ فکر میں، جن کی ان بزرگوں نے بنیاد رکھی، دائرہ و سائر توانتے ہیں — لیکن محصور و منحصر کسی میں بھی نہیں جانتے۔ کیوں کہ ہمارے نقطہ نگاہ سے صحت و صواب کی استواریاں غیر مشروط طور پر صرف کتاب اللہ و سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص ہیں!

ارشاد باری تعالیٰ ہے :

”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا“

(النساء : ۵۹)

”ایمان والو، اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرو، اور اولی الامر کی بھی۔ پس اگر تمہارا کسی امر میں نزاع ہو جائے تو اگر تم اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو اسے اللہ تعالیٰ اور رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف لوٹا دو۔ یہ بہتر بھی ہے اور اس کا مال بھی اچھا ہے!“

چنانچہ ہمارے عقیدہ کی رو سے استدلال و تاویل کا یہی دو چیزیں نقطہ آغاز ہیں اور یہی نقطہ آخر! — دوسرے لفظوں میں سورہ نساء کی اس آیت کو ہم ”PREAMBLE“ یا قانونی اساس سمجھتے ہیں۔ اس آیت ہی کے لب و لہجہ میں علماء سے کہتے ہیں کہ ہر متنازع مسئلہ میں اول و آخر کتاب و سنت ہی کی طرف رجوع کیجیے — تقلید و عدم تقلید کی اصطلاح میں پڑے بغیر کہ اس میں قدرے الجھاؤ اور جھول ہے۔ ہم محبت و وفا کی زبان میں دعویٰ دارانِ عشق رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ خدا را آپ ہی بتائیے، اگر کسی گروہ نے یہ فیصلہ ہی کر لیا ہو کہ طلب و آرزو کے دامن کو وہ صرف انھی گل بوٹوں سے سجائے گا جو قرآن و سنت کے سدا بہار دستان میں نظر افروز ہیں — اور کچھ لوگوں نے ازراہ شوق ہی مناسب جانا ہو کہ ان کی نظر اگر کسبِ صُوکِ رے کی تو انہی انوار و تجلیات سے، جو چہرہ نبوت کی زریب و زینت ہیں — یا زمان و مکان کے فاصلوں کو ہٹا کر اگر کوئی بے تاب اور متجسس نگاہ اسی جہاں آرا کا براہِ راست مشاہدہ کرنا چاہتی ہے، جس کی جلوہ آرائیوں نے عشاق کے دلوں میں پہلے پہل ایمان و عمل کی شمعیں فروزاں کیں، تو آیا یہ کوئی جرم، گناہ یا معصیت ہے؟ اور اگر یہ جرم اور معصیت ہے، تو ہمیں اقرار ہے کہ ہم و ابستگانِ دامن رسالت اور اسیرانِ حلقہ نبوت مجرم اور گناہ گار ہیں۔

تقلید و عدم تقلید کا مسئلہ دراصل فنی و علمی سے زیادہ نفسیاتی ہے، سوال یہ ہے کہ ٹھیکہ اسلام کی رو سے ہماری اولین ارادت کا مرکز کون ہے؟ ہماری پہلی اور بنیادی وابستگی کس سے ہونی چاہیے؟ اور پیش آمدہ مسائل میں مشکلات کے حل و کشود کے سلسلہ میں ہمیں اول اول کس کی طرف دیکھنا چاہیے؟ — کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی چشم کشا اور ابدی تعلیمات کی طرف، یا فقہی مدارس فکر کی وقتی اور محدود تعبیرات کی طرف؟ — اس سے قطع نظر کہ تقلید سے فکر و نظر کی تازہ کاریاں مجروح ہوتی ہیں، اور اس سے بھی قطع نظر کہ اس سے خود فقہ و استدلال کے قافلوں کی تیز رفتاری میں رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں،

اور تہذیب و فن کی وسعتیں زندگی، حرکت اور ارتقاء سے محروم ہو جانے کے باعث حد درجہ سستا اختیار کر لیتی ہیں۔ اصل نقص اس میں یہ ہے کہ اس سے عقیدہ و محبت کا مرکز ثقل یکسر بدل جاتا ہے۔ یعنی بجائے اس کے کہ ہماری ارادت و عقیدت کا محور و قبلہ، اول و آخر کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رہے، ہماری عصیتیں مخصوص فقہی مدارس سے وابستہ ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اور غیر شعوری طور پر قلب و ذہن اس بات کا عادی ہو جاتا ہے کہ بحث و تمحیص کے مسئلہ میں کتاب و سنت سے کسی نہ کسی طرح مسائل کی وہی نوعیت ثابت ہو جو ہمارے حلقہ اور دائرہ کے تقاضوں کے عین مطابق ہو۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ربط و تعلق کی کیفیتیں معرفت (DOJECTIVITY) چاہتی ہیں اور اس بات کی مقتضی ہیں کہ ہر مسئلہ اور امر میں نقطہ نظر کسی خاص مدرسہ فکر کی تائید و حمایت کرنا نہ ہو، بلکہ اس شئی کی تصدیق مقصود ہو کہ اخذ و قبول کے لحاظ سے کون صورت کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زیادہ قریب تر ہے۔

ممکن ہے اس پر کوئی صاحب کلمہ اٹھیں کہ مسائل پر غور و فکر کرنے کا یہ تو محض ایک انداز ہو، یا زیادہ سے زیادہ اہل حدیث کی نفسیات و مبنی کی تشریح ہوئی، لیکن حل طلب سوال تو یہ ہے کہ صرف انداز فکر اور اسلوب استدلال سے کوئی مذہب یا مسلک کب متعین ہوتا ہے؟ — مسلک اور مذہب کی تعیین کے لیے ضروری ہے کہ اہل حدیث کے مخصوص مابعد الطبیعیاتی تصورات ہوں، علیحدہ اور متمیز علم الکلام ہو، اور کتاب و سنت کی واضح تعلیمات پر مبنی اپنا علم الفقہ ہو۔ اسی کی روشنی میں ان کی خاص تاریخ ہو، جس سے کہ ان کے ارتقائے علمی کا پتہ چل سکے، اور معلوم کیا جاسکے کہ ماضی کے قریب و بعید کے مختلف ادوار میں انھوں نے مذہب و دین کی تشریح و تعبیر کے سلسلہ میں کیا کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں؟ یا اسلامی تہذیب و تمدن کی نشاط آفرینیوں میں ان کا کیا حصہ ہے؟

اعتراض بظاہر بہت وزنی ہے، لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ ہمارا مسلک واقعی ”مذہب مدونہ“ کی فہرست میں شامل نہیں۔ یہ ایک مذہب ہے جس کے اصول اور کلامی و فقہی ہیمنے گونجیں ہیں، تاہم اصطلاحی معنوں میں یہ مذہب نہیں ہے۔ اس کے ماننے والوں کے باقاعدہ معمولات ہیں اور عقیدہ و عمل کا متعین قالب ہے، مگر اسے کسی لحاظ سے بھی گروہ نہیں کہنا چاہیے۔ اسی طرح اس کی اصلاح و تجدید کے کارناموں پر مشتمل اپنی ایک تابناک

تاریخ بھی ہے لیکن یہ تاریخ صرف انہی کی تاریخ نہیں ہے، اسے پورے اسلام کی تاریخ قرار دینا چاہیے۔

بظاہر یہ بات حد درجہ تضاد لیے ہوئے ہے، لیکن ذرا غور کیجیے گا تو معلوم ہو گا کہ اسی تضاد میں اس کا حل بھی مضمر ہے۔ کون نہیں جانتا کہ پہلی صدی ہجری کے آخر ہی میں اسلام کو شدید نوعیت کے دینی و سیاسی انحرافات سے دوچار ہونا پڑا۔ اور تیسری صدی بھی اختتام کو نہیں پہنچی تھی کہ ان انحرافات نے شدید نوع کے تعصبات کا روپ دھار لیا۔ اسی عرصہ میں مسئلہ امامت و خلافت کی وجہ سے شیعیت ابھری اور اس کے پہلو بہ پہلو ایک تاریخی حادثہ کی بناء پر غارِ حیت نے جنم لیا، جس نے آگے چل کر مستقل فتنے کی شکل اختیار کر لی۔ انہی سیاسی اختلافات نے ارجاء کی مصلحتوں کو ہوا دی اور مسلمان مرجہ اور غیر مرجہ دو گروہوں میں بٹ گئے۔ نیز یونانی علوم کے فروغ و ارتقاء نے اعتزال و جہیت کی تخلیق کی، جس نے صدیوں تک مسلمانوں کو گونا گوں عقلی اختلافات میں الجھائے رکھا، نتیجہ یہ ہوا کہ علمی و دینی حلقوں میں بیسیوں نئے مسئلے پیدا ہو گئے۔ صفاتِ باری عین ذات ہیں یا غیبی؟ استواء علی العرش کے کیا معنی ہیں؟ قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق؟ قدرت و استطاعت افعال سے پہلے ہے یا ان کے ہم قرین ہے؟ انسان مجبور ہے یا مختار؟ اللہ تعالیٰ محالات پر قادر ہے یا نہیں؟ خلقِ شئی سے کیا مراد ہے؟ غور و سال اطفال قیامت کے روز عذاب کا ہدف بنیں گے یا نہیں، جنت و دوزخ عارضی ہیں یا دائمی؟ اور روح کیا ہے؟

یہ اور اس نوع کے عجیب و غریب مسائل، جن کی وجہ سے اسلامی صفوں میں انتشار و تشتت کا پیدا ہونا ناگزیر تھا۔ اسی دور میں غنوصیت (Gnosticism) نے، جس کے ماننے والے عراق میں کثرت سے تھے، تصوف کو حریفانہ شکل میں پیش کیا۔ اور تقدس و ریاضت کے بہرہ ور ہیں اس یقین کو دلوں میں آٹارنے کی کوشش کی کہ علومِ نبوت کے مقابلہ میں عرفان و ادراک کا ایک اور یقینی ذریعہ کشف بھی ہے، جس کی مدد سے براہِ راست حقائق کو نیہ و دینیہ کا پالینا ممکن ہے۔

قریب قریب یہی وہ زمانہ ہے جس میں فقہی مذاہب مدوّن و مرتب ہوئے۔ ان کے پرتوش حامی ایک دوسرے کے مقابل میں صفِ آراء ہوئے اور باقاعدہ مناظرہ و جدل کی بنیاد پڑی۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ عصبیتیں ابھریں، حلقے بنے اور آخر میں تقلید و جمود

نے اسلامی معاشرہ کی اکثریت کو اپنی پلڈیٹ میں لے لیا۔

یہاں غور طلب یہ نکتہ ہے کہ گمراہیوں کے اس ہجوم میں اسلام کی فطرت میں اصلاح احوال کی جو قدرتی صلاحیتیں تھیں، کیا وہ چپ چاپ یہ تماشا دیکھتی رہیں؟ اور کسی گمراہ، کسی جماعت کو یہ توفیق نصیب نہ ہوئی کہ وہ ان انحرافات کی نشاندہی کرے اور یہ بتائے کہ ان گمراہیوں کے مقابلہ میں اسلام کا صحیح موقف کیا ہے؟ خوش قسمتی سے واقعہ یہ نہیں ہے۔ تاریخ و سیر سے سرسری واقفیت رکھنے والے حضرات بھی جانتے ہیں کہ بغوائے حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر بد دور میں ایسے لوگوں کا وجود رہا ہے کہ جنہوں نے کلمہ حق کا برملا اظہار کیا ہے، جنہوں نے تجدید و اصلاح کی ذمہ داریوں کو نبھالا ہے، اور اسلام کے چہرہ زیبیہ سے بدعات کے گرد و غبار کو دور کرنے کی مقدور بھرماسعی جاری رکھی ہیں۔ جنہوں نے ذخائر حدیث کی حفاظت کی، جنہوں نے عقائد کی پیچیدگیوں کو سلجھایا اور اپنی مروجہ فقہی مذاہب کے مقابلہ میں سنت پر مبنی، سنت سے مستنبط اور سنت سے قریب تر مسائل کی طرف فقہاء کی عنان توجہ و التفات کو موڑ دینے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ یہ گمراہ اہل الحدیث والسنۃ کا ہے۔

امام ابو الحسن اشعری نے ”مقالات الاسلامیین“ کی پہلی جلد کے آخر میں تقریباً پانچ صفحوں میں اس گمراہی کے عقائد و سیرت کا ایک دل چسپ اور دل نواز نقشہ پیش کیا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ چوتھی صدی ہجری کے وسط تک اہل الحدیث والسنۃ کے سامنے کلام و فقہ کے کیا مسائل تھے؟ اور ان حضرات نے ان مسائل کو کیوں کر حل کیا؟ ہم اس سلسلہ میں دراصل کہنا یہ چاہتے ہیں کہ اصلاح و تجدید کی یہ تمام کوششیں، جو مختلف حلقوں اور مختلف زمانوں میں فقہ و کلام کی طرف طرازیوں کو کتاب و سنت کے سانچوں میں ڈھالنے کی غرض سے انجام پائیں، ہماری ہیں۔ ان کا علم الکلام ہمارا علم الکلام ہے، ان کی فقہ ہماری فقہ ہے اور ان کی تاریخ ہماری تاریخ ہے۔

لیکن اس کے باوجود ہم نے کسی متعین مدرسہ یا فقہ یا علم الکلام کے بعض بنے بنائے اصولوں کو اس بناء پر اپنانے کی کوشش نہیں کی ہے کہ مبادا ہماری عصبیتیں بھی اپنا محور بدل لیں۔ اور بجائے اس کے کہ عقیدت و وابستگی کے واسطے براہ راست کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے وابستہ رہیں، ہم بھی اس تضاد کا شکار ہو کر نہ رہ جائیں

کہ ماضی میں تمام فقہی و کلامی مذاہب جس کا شکار ہوئے ہیں۔

گویا ہماری نفسیات دینی اور ہمارے جذبہ حب رسولؐ کا تقاضہ یہ ہے کہ فکر و عمل کی کسی صورت میں بھی ہم بجز کتاب اللہؑ طاعت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمانبرداری کے دیگر کسی تقلید، کسی تقلید اور انتساب کو اپنے لیے گوارا نہ کریں۔ اور زمان و مکان اور اشخاص و ائمہ سے قطع نظر، ہر اس سچائی کو اپنائیں، ہر اس استدلال کو تسلیم کریں اور تجدید و اصلاح کی ہر اس کوشش کو سراہیں، جو قرآن و حدیث پر مبنی ہو۔

اللہ تعالیٰ سے دعاء ہے کہ وہ اسی حال میں ہمیں زندہ رکھے اور جذب و کیف کے اسی جانفزا عالم میں موت سے دوچار کرے۔ آمین! (بشکریہ محدث "بنارس")

شعروادب

جناب فضل الرحمان فضل

حسب باری تعالیٰ

یا رب تیری شان نرالی	تو ہے سب دنیا کا والی
تیری حمد و ثنا کرتا ہے	پتہ پتہ ڈالی ڈالی
تیرے لطف و کرم سے باقی	گلشن دنیا کی ہریالی
تیری عنایت سے قائم ہے	تازگی اور پھولوں کی لالی
تو ہی سب روزی رساں ہے	سب کی کرتا ہے رکھوالی
تو ہے داور، مصطفیٰ رہبر	باقی ساری خام خیالی
یا رب میری جھولی بھر دے	بھر دے بھر دے جھولی خالی
خالی ہاتھ نہیں جاتا ہے	تیرے در سے کوئی سوالی
یا رب اونچا رہے ہمیشہ	پرہیزم اپنا بسز ہلالی

لاج میری محشر میں رکھنا
فضل ہے تیرے در کا سوالی